اقبال کی "علم الاقتصاد"

شیخ محمد عثمان

بہت کم لوگوں کو اس کی خبر ہوگی کہ علامہ اقبال جیسے عظیم المرتبت شاعر اور فلسفی کی پہلی کتاب اقتصادیات سے تعلق رکھتی تھی۔ اقبال جیسا کہ عام طور سے معلوم ہے، ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم۔اے کرنے کے بعد پہلے اورینٹل کالج اور پھر گورنمنٹ کالج میں استاد مقرر ہوئے تھے۔ سرکاری ملازمت کا یہ سلسلہ ۱۹۰۵ء تک قائم رہا۔ اس زمانے میں انہوں نے ہندوستانی قومیت اور جذبہ' حب‌الوطن میں ڈوب کر ہمالہ، ترانہ' ہندی، نیا شوالہ، تصویر درد، اور ہندوستانی بچوں کا گیت ایسی نظمیں لکھیں جن کے باعث اقبال تھوڑے ہی عرصے میں ملک کے طول و عرض میں مشہور ہوگئے اور ایک شاعر کی حیثیت سے ہر طبقے اور ہر محفل میں ان کی پذیرائی کی جانے لگی۔ عین اسی زمانے (۱۹۰۳ء) میں اقبال نے اردو نثر میں اپنی پہلی کتاب لکھ کر شائع کی۔ کتاب کا عنوان ہے 'علم الاقتصاد'۔ دیباچہ میں انہوں نے پروفیسر آرنلڈ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ کتاب ان کی تحریک پر لکھی گئی۔ جن بزرگوں اور دوستوں کا اقبال نے بطور خاص شکریہ ادا کیا ہے، ان میں ایک 'مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ بھی ہیں جنہوں نے کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق 'قابل قدر' اصلاح دی۔ انتساب میں اقبال نے کتاب کو اپنی 'علمی کوششوں کا پہلا ثمر' بتایا ہے۔

یہ کتاب اپنی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد بازار سے ہی غائب ہوئی کہ اگر خود اقبال کے خطوط میں ایک آدھ مقام پر اس کا ذکر نہ آگیا ہوتا تو بعد میں آنے والی نسلیں شاید کبھی جان بھی نہ سکتیں کہ اقبال نے عین عالم شباب میں شعر و شاعری اور درس و تدریس کی دوہری مشغولیتوں کے درمیان دولت اور اسکی تقسیم و صرف جیسے موضوعات پر ایک خاصی جامع کتاب لکھنے کے لئے وقت نکال لیا تھا۔ اقبال اکیڈیمی کراچی ہمارے شکریے کی مستحق ہے جس نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد کتاب کا ایک نسخہ

ڈھونڈ نکالا اور اس کا ایک نیا اور خوبصورت ایڈیشن شائع کردیا ۔

کتاب کی اشاعت نو کئی لحاظ سے اہم اور مفید ثابت ہوگی ۔ پہلی بات تو یہی کہ ہم اپنے ایک عظیم محسن اور مفکر کی اولین علمی کاوشوں کے نتیجے سے غافل و بے خبر تھے ۔ اس ایڈیشن نے اس کمی اور محرومی کو دور کردیا ۔ دوم، اس کتاب کے سامنے آجانے سے حیات اقبال پر لکھنے والے اور فکر اقبال کو سمجھنے والے اقبال کی شخصیت و افکار کی ایک جامع تر تصویر تیار کرنے کے قابل ہونگے ۔ سوم، کتاب کی موجودگی و مطالعہ سے اس خیال کو مزید تقویت و سند حاصل ہوگی کہ اقبال نے اپنی نظم و نثر میں معاشی مسائل کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اور مختلف معاشی نظامات پر جسطرح تنقید کی ہے اسکے پیچھے معاشیات کے ایک سچے اور مخلص طالب علم کی نظر و بصیرت کارفرما تھی ۔ اور سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب کی بدولت بہت سے معاشی مسائل کے بارے میں اقبال کے خیالات کا ہمیں واضح علم حاصل ہوگا ۔ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ جو وضاحت و صراحت نثر میں ہوتی ہے، لاکھ اثر و تاثیر کے باوجود وہ نظم میں ممکن نہیں ۔ نثر کا اسلوب کہیں زیادہ واشگاف اور قطعی ہوتا ہے ۔ یہاں ضمناً ایک بات اور عرض کر دینے کے قابل ہے ۔ کتاب کا اسلوب بیان ایسا عمدہ، ایسا سلیس، ایسا متعین و مؤثر ہے کہ علمی مضامین بیان کرنے کے لئے آج بھی اسے نمونے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اقبال اپنے افکار کو بیان کرنے کے لئے اردو نثر کا پیرایہ اختیار کرتے تو وہ اتنے ہی کامیاب ہوتے (شاید زیادہ) جتنے وہ نظم کے ذریعے سے کامیاب اور مؤثر ثابت ہوئے ہیں ۔

کتاب پانچ حصص اور بیس ابواب پر مشتمل ہے ۔ پہلے حصے میں علم الاقتصاد کی ماہیت اور دولت کی تعریف کی گئی ہے اور باقی چار حصوں میں معاشیات کے چار بنیادی شعبوں سے بہ تفصیل بحث ہے ۔ جس چیز کو ہم دولت کہتے ہیں، ماہرین نے اس کے چار بڑے بڑے شعبے قرار دئے ہیں :— (۱) دولت کی پیدائش (Production) ۔ (۲) دولت کا تبادلہ (Exchange) ۔ (۳) دولت کی تقسیم (Distribution) ۔ (۴) دولت کا صرف یا استعمال (Consumption) ۔ اقبال نے ان موضوعات پر ضروری اور اپنے وقت کے مروجہ افکار و نظریات ہی کو پیش نہیں کیا، بسا اوقات ان پر جرح و تنقید بھی کی ہے ۔ اور اپنی ذاتی آراء بھی درج کی ہیں۔ انہی ذاتی آراء کا مطالعہ اسوقت ہمارے پیش نظر ہے ۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں ایسے کئی ماہرین اقتصادیات پیدا ہوئے جو دولت اور حصول دولت کے معاملے میں وہی ذہن رکھتے تھے جو سیاست و ریاست کے بارے میں میکیاولی کا تھا۔ میکیاولی قوت محض اور اقتدار محض کا علمبردار تھا اس نے یورپ کی ابھرتی ہوئی مملکتوں کے سربراہوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ بادشاہت اور اقتدار بذات خود اعلیٰ ترین قدر ہے جسکو کسی اور قدر یا سہارے کی ضرورت نہیں۔ اسکے نزدیک حاکمیت اس قابل تھی کہ اسے مقصود بالذات سمجھ کر حاصل کیا جائے۔ اور اسے مذہبی اور اخلاقی تصورات کی ''دستبرد،، سے آزاد و بالاتر رکھا جائے۔ اس کی تعلیم کا لب لباب یہ تھا کہ سیاست سیاست ہے اور اخلاق اخلاق اور ان دونوں کی راہیں جدا جدا ہیں۔

اس طرح یورپ کے بڑھتے ہوئے سامراج اور ایشیا اور افریقہ کی معاشی پسماندگی اور زبوں حالی کو دیکھ کر بہت سے مغربی معاشیین نے یہ نظریہ پیش کیا کہ معاشیات کا کھیل معاشیات کے طور پر کھیلا جائے اور اسے اخلاق، مذہب یا نام نہاد انسانیت کا پابند نہیں ہونا چاہئے۔ آزاد معیشت (Free Economy) ان کا نعرہ تھا اور ان کے خیال میں کسی طبقے یا خطے کے معاشی مفادات کے تحفظ کے لئے قوانین وضع کرنا یا اس قسم کی دوسری کوششیں محض لغو اور خلاف فطرت تھیں۔ معیشت کا دریا اپنے قدرتی رخ اور بہاؤ پر بلا روک ٹوک بہنا چاہئے۔

اس نظریۂ معیشت کو یورپ میں بھی بعض لوگوں نے چیلنج کیا تھا اور امریکہ میں بھی۔ کارل مارکس اور اسکے ہم خیال معاشیین تو اس نظرئے کے شدید ترین دشمن تھے۔ اسکے باوجود بیسویں صدی کے اوائل تک یعنی جنگ عالمگیر اول سے پہلے عملاً اسی نظرئے کی حکمرانی تھی۔

اقبال نے بھی اس نظرئے کی تردید کی ہے۔ لیکن اس تردید کے وجوہ بہت سے دوسرے ارباب نظر سے مختلف ہیں۔ مارکس نے اس بنا پر اسکی مخالفت کی تھی کہ یہ دولتمندوں کی ایک بنائی ہوئی بات (چال) ہے جو خود غرضی کو چھپانے اور دوسروں کو کمزور پا کر لوٹ لینے کی آسان ترکیب ہے۔ بعض نے آزاد معیشت کی مخالفت انسانی ہمدردی کے نام پر کی ہے۔ اقبال کا نقطۂ نظر زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ ان کے نزدیک انسان اس کائنات میں

اپنے کچھ اعلے اور افضل مقاصد رکھتا ہے۔ دوسرے تمدنی اداروں کی طرح معاشیات کا بھی فرض ہے کہ وہ اسے ان مقاصد کے حصول میں مدد دے۔ اگر دولت ایسا نہیں کرتی تو اس کا وجود اسکے عدم سے بدتر اور ناقابل اعتنا ہے۔ دولت کو بلند ترین مقاصد انسانی کے تابع ہونا چاہئے۔ چنانچہ علم الاقتصاد کا تعلق علم تمدن سے ثابت کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں :

''کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلے ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے۔ یا یوں کہو کہ ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ تمدنی لحاظ سے ہوتا ہے۔ دولت ہی کو لے لو۔ اگر یہ شے ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہم کو مدد نہیں دے سکتی تو پھر اس کا کیا فائدہ ؟،،*

اپنے فکر کے اس ابتدائی مرحلے پر بھی اقبال کی نظر دولت پرستی اور لذت کوشی کے مضر اثرات پر تھی اور وہ چاہتے تھے کہ جدید مغربی معاشرہ میں آزاد معیشت اور دولت کی محبت نے جو نتائج عشرت پسندی اور نفس پروری کی صورت میں پیدا کئے ہیں، ان سے دوسرے لوگ بچیں اور سبق حاصل کریں۔ ان کی رائے میں :

''بعض اشیا جن سے عارضی لذت حاصل ہوتی ہے، انسانی زندگی کو تازگی اور شگفتگی بخشنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں لیکن اس کے برخلاف یہ بھی سچ ہے کہ بعض پرانی مہذب قوموں کی بربادی عارضی لذات کی جستجو اور ان اشیاء سے بے پرواہ رہنے کی وجہ سے ہوئی، جن سے انسانی زندگی کو حقیقی قوت اور جلا حاصل ہوتی ہے۔ زمانۂ حال کی تہذیب اس صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ لذیذ اور مفید میں امتیاز کیا جائے۔ اور اس امتیاز کو ملحوظ خاطر رکھ کر اپنے افعال و اعمال کو مرتب کیا جائے تاکہ ہمیں اپنی زندگی کی اصل غرض یعنی بہبودئ بنی نوع انسان کے حصول میں آسانی ہو،،**

(۲)

اقبال کے معاشی موقف کے بارے میں پہلی بات تو یہی جاننے والی تھی

---

*''علم الاقتصاد،، مطبوعہ اقبال اکادمی کراچی ۱۹۶۱ء، صفحہ : ۲۱

**ایضاً صفحہ : ۱۲

کہ وہ دولت اور تنظیم دولت کو افراد کے بلند اخلاق و روحانی نصب العین کے تابع دیکھنا چاہتے ھیں ۔ دوسری اھم بات جو مجھے یہاں بیان کرنی ھے، یہ ھے کہ اقبال غریبی اور مفلسی کے بڑے دشمن تھے اور دل سے آرزومند تھے کہ جہاں تک ممکن ھو انسانوں کو اس کے خوفناک چنگل سے رہائی دلائی جائے ۔ مشرق میں زیادہ اور مغرب میں کم ایسے بے شمار شاعر و ادیب اور مصلح و مفکر ھو گزرے ھیں جنھوں نے افلاس کو سراھا اور اسکی برکتیں اور فائدے گنوائے ھیں ۔ ان ارباب نظر میں سعدی اور شیکسپئیر بھی شامل ھیں۔ اقبال کے مزاج میں مشرقیت اور درویشی کا رنگ غالب تھا مگر دولت اور افلاس کے معاملہ میں ان کی نظر، یوں کہنا چاھئے کہ نہائت سائنٹفک اور حقیقت پسند تھی ۔ وہ اگرچہ دولت کو مقصود بالذات نہیں سمجھتے تھے تاھم افلاس کے ساتھ کسی سمجھوتے کے لئے بھی تیار نہ تھے وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو غریبی کی مضرتوں اور زھر ناکیوں کے ساتھ اسکی 'فیض رسانیوں' کے بھی قائل ھوتے ھیں ۔ افلاس ان کی نظر میں انسان کی شخصیت کا سب سے بڑا دشمن ھے لہذا اقبال اس کے سب سے بڑے دشمن ھیں ۔ جسطرح آزادی کے بغیر فرد کی ذات بھرپور نشو و نما نہیں پاسکتی، اسی طرح معاشی اطمینان اور خوشحالی کے بغیر شخصیت کی تکمیل ممکن نہیں ۔ وہ اس خیال کے علمبردار ھیں کہ جسطرح رفتہ رفتہ نوع انسانی نے اپنے اندر سے غلامی کی انسانیت کش رسم کو ختم کیا ھے حالانکہ ارسطو جیسا فلسفی اسکو انسانی تمدن کی بقا کی لازمی شرط قرار دیتا تھا، اسی طرح اب اس بات کی اشد ضرورت ھے کہ نسل انسانی اپنے درمیان سے افلاس کی لعنت کا خاتمہ کردے ۔ 'علم الاقتصاد' کے دیباچہ کا یہ حصہ توجہ سے پڑھنے کے لائق ھے :

''غریبی قوائے انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ھے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلہ آئینہ کو اسقدر زنگ آلود کر دیتی ھے کہ اخلاق اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ھو جاتا ھے۔ معلم اول یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لئے ضروری جزو ھے ۔ مگر مہذب اور زمانہٗ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوت مدارج بجائے اس کے کہ قیام تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ھو، اسکی تخریب کرتا ھے اور انسانی زندگی کے ھر پہلو پر نہائت مذموم اثر ڈالتا ھے ۔ اس طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ھوا ھے کہ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ھے ؟ کیا ممکن نہیں کہ ھر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ھو؟ کیا ایسا نہیں

ہوسکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلادینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے؟،، *

ایک اور جگہ افلاس کو ''ام الخبائث،، بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :
''تم جانتے ہو مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے ۔ اگر ایسی بلائے بے درماں کا قلع قمع ہو جائے تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئے گی ۔ اور چوری، قتل، قمار بازی اور دیگر جرائم جو اس دہشت ناک آزار سے پیدا ہوتے ہیں، یک قلم معدوم ہوجائیں گے،،**

(۳)

''علم الاقتصاد،، کے مطالعے سے اس بات کی کافی شہادت مل جاتی ہے کہ اپنے فکر و شعور کے اس ابتدائی دور میں بھی اقبال اس فریب کو خوب سمجھتے تھے جو انگلستان اور ہندوستان کے باہمی تجارت کے نام پر اہل ہند کے ساتھ کھیلا جارہا تھا ۔ زندگی کے آخری دور میں اس ظلم و استحصال کے خلاف انہوں نے واشگاف اور نہایت پر زور لفظوں میں آواز بلند کی اور اہل مشرق کو مخاطب کرکے کہا کہ مغرب کی سیاسی چالوں ہی سے نہیں، اسکی معاشی فریب کاریوں سے بھی خبردار رہیں ۔ مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق،، یہی موضوع رکھتی ہے ۔ ''علم الاقتصاد،، میں ''پس چہ باید کرد،، کا سا زور، قطعیت اور وضاحت تو نہیں، پھر بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو اس نقصان کا شدید احساس پیدا ہوچکا تھا جو باہمی تجارت کے پردے میں انگلستان کے ہاتھوں اس وقت کے ہندوستان کو پہنچ رہا تھا ۔ ایک مقام پر جہاں وہ ہندوستان کے افلاس کے متعدد وجوہ بیان کرتے ہیں، انگلستان کے ساتھ اسکی غیر متوازن اور غیر مساویانہ تجارت کو سر فہرست رکھتے ہیں :

''اس ضمن میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب دو ممالک آپس میں تجارت کرتے ہیں تو بسا اوقات ایک ملک دوسرے

---

*دیباچۂ مصنف، صفحہ، ۳۲ ۔
**ایضاً صفحہ : ۲۰۵

ملک کا زیر بار ہو جاتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیر بار شدہ ملک کی اشیاء برآمد و درآمد کے درمیان مساوات قائم نہیں رہتی۔ کیونکہ اسکو نہ صرف اپنی درآمد کے عوض میں اشیاء بھیجنی پڑتی ہیں بلکہ اپنے قرض کی ادائیگی میں یا تو اپنی اشیائے برآمد میں زیادتی کرنی پڑتی ہے یا مزید روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اسوجہ سے ایک ملک میں روپے کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور دوسرے میں کم ہوتی جاتی ہے۔ جہاں روپے کی تعداد بڑھتی ہے وہاں اسکی قدر کم ہوتی ہے اور اشیاء کی قیمت بڑھتی ہے۔ لہذا وہاں اشیاء کی فروخت سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی برآمد اسکی درآمد سے بہت زیادہ ہے۔ چونکہ ہم ضروریات کے لئے انگلستان کے محتاج ہیں، اس واسطے ہم زیر بار ہیں،، *

ضمناً یہ جان لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ متذکرہ بالا سبب کے علاوہ اقبال کے نزدیک ہندوستان کی مفلسی کے اور کیا کیا اسباب تھے؟ مزید برآں اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ نہ صرف فلسفیانہ بلکہ تمدنی اور معاشی امور میں بھی اقبال کی نظر کیسی گہری اور رقیق تھی۔ اوپر کے پیراگراف کے بعد لکھتے ہیں!

''علاوہ اسکے ہم کو سلطنت ہند کے مصارف، حکام کی تنخواہیں اور فوجی اخراجات وغیرہ ادا کرنے پڑتے ہیں۔ لہذا ہمارا ملک دن بدن زیادہ سے زیادہ زیر بار ہوتا جاتا ہے۔ مزید برآں ہمارے ملک میں کئی وجوہ کے باعث (مثلاً خارجی حملہ آوروں کا ہندوستان کی قدیم جمع کردہ دولت کو لوٹ کر لیجانا، آخیر کے مغلیہ بادشاہوں کی عیاشی، عوام کی ناعاقبت اندیشی اور کمئی تعلیم کی وجہ سے روپیہ کی اصل حقیقت سے بے خبری وغیرہ) سرمائے کی مقدار کم ہے۔ انگلستان کے قبضے میں سرمائے کی بے انتہا مقدار ہے۔ اس واسطے ہمارے ملک میں رفاہ عام کے کاموں مثلاً آب پاشی وغیرہ میں بھی اس ملک کا سرمایہ صرف ہوتا ہے جس سے انگلستان فائدہ عظیم اٹھاتا ہے، اگرچہ ہم کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا ہے،، **

---

*ایضاً، صفحہ ۱۰۲-۱۰۳

**ایضاً، ۱۰۳

اقبال کے معاشی اور تمدنی افکار میں ایک اہم خیال یہ ہے کہ زمین کا مالک جاگیردار، زمیندار اور اس اعتبار سے کوئی خاص فرد یا خاندان نہیں بلکہ پوری قوم یا پھر وہ شخص ہے جو اپنی محنت و مشقت سے، اپنا خون پسینہ ایک کرکے اس سے فصل پیدا کرتا ہے ۔ اقبال شخصی جائداد کے مخالف نہ تھے لیکن جہاں تک زمین کی ملکیت کا تعلق ہے، ان کی انصاف پسند اور حق شناس طبیعت 'مالکوں، اور جاگیرداروں کے نظام کو قبول نہ کرتی تھی۔ 'بانگ درا، میں انہوں نے اس خیال کو اکبر الہ آبادی کے رنگ میں پیش کیا ہے ۔ 'جاوید نامہ، میں الارض للہ کے زیر عنوان انہوں نے بڑے مؤثر اور مدلل انداز سے زمین کی شخصی ملکیت کے تصور کی تردید کی ہے ۔ اسی طرح 'بال جبریل، میں ہمیں ذیل کی پر زور نظم ملتی ہے :

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار؟
خاک یہ کسکی ہے؟ کسکا ہے یہ نور آفتاب؟
کسنے بھردی موتیونسے خوشہ' گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی یہ خوئے انقلاب؟
وہ خدایا ! یہ زمین تیری نہیں، میری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

''علم الاقتصاد، میں اگرچہ وہ حسن بیان نہیں ہے جو اوپر کی نظم میں پایا جاتا ہے تاہم اقبال نے غیر مبہم لفظوں میں ان لوگوں کا ساتھ دیا ہے جو ملکیت زمین کے بارے میں جاگیردارانہ نظام کے مخالف ہیں ۔ چنانچہ زرعی لگان کے باب کے شروع میں اپنی بحث کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''تمدن انسانی کی ابتدائی صورتوں میں حق ملکیت یا جائداد شخصی کا وجود مطلق نہ تھا محنت کی پیداوار میں حسب ضرورت ہر شخص کا حصہ تھا ۔ ہر شے ہر شخص کی گویا ملکیت تھی اور کوئی خاص فرد یہ دعوی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ خاص شے میری ملکیت ہے اور یہ کسی اور کی ۔ نہ کہیں افلاس کی شکایت تھی، نہ چوری کا کھٹکا تھا ۔ قبائل انسانی مل کر گذران کرتے تھے اور امن و صلح کاری کے ساتھ

اپنے دن کاٹتے تھے یہ مشارکت جو اس ابتدائی تمدن میں انسان کا اصول معاشرت تھی، ہمارے ملک (یعنی سابق ہندوستان) کے اکثر دیہات میں اس وقت بھی کسی نہ کسی صورت میں مروج ہے۔ زمانہ حال کے بعض فلسفی اس بات پر مصر ہیں کہ تمدن کی یہی صورت سب سے اعلے اور افضل ہے۔ نظام قدرت میں نوع انسان کے تمام افراد مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ کوئی کسی کا دیل نہیں ہے اور تمام تمدنی امتیازات مثلاً سرمایہ دار اور محنتی، آقا و ملازم وغیرہ بالکل بے معنی ہیں۔ جائداد شخصی تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ لہذا اقوام دنیا کی بہبودی اسی میں ہے کہ ان بے جا امتیازات کو یک قلم موقوف کرکے قدیمی اور قدرتی اصول مشارکت فی الاشیاء کو مروج کیا جائے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم ملکیت زمین کی صورت میں ہی اس اصول پر عمل درآمد کیا جائے۔ کیونکہ یہ شے کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے جس پر قوم کے ہر فرد کو مساوی حق ملکیت حاصل ہے،،۔

زمین کے غیر شخصی ملکیت ہونے کے حق میں جو دلائل اقبال نے مختلف اوقات و مقامات پر دئے ہیں، ان میں سے کچھ کا ذکر اوپر آیا ہے۔ پہلی دلیل وہ قرآن حکیم کی اس آیت سے دیتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ زمین اللہ کی ہے (الارض للہ)۔ دوسری دلیل اگرچہ عام عقلی دلیل کہی جاسکتی ہے مگر اسکی تائید بھی قرآن حکیم سے حاصل ہوتی ہے۔

ایک آیہ مبارکہ ہے: لیس للانسان الا ماسعیٰ، جس چیز کے لئے انسان نے کوشش نہیں کی اس پر اس کا کوئی حق نہیں۔ اقبال نے اس سے یوں استدلال کیا ہے کہ مزدور اور کاشتکار کی محنت کا پھل زمیندار اور جاگیردار کیوں کھائے؟ جب اس نے محنت نہیں کی جان نہیں کھپائی تو پھر وہ حاصل میں کیونکر حصہ دار ہوسکتا ہے۔ ''علم الاقتصاد،، کے صفحہ ۱۰۲ پر اقبال نے اس نقطہ نظر کے حق میں ایک اور دلیل بھی دی ہے۔ چونکہ اس کا ذکر غالباً پھر کسی کتاب یا نظم میں نہیں آیا اور اپنی جگہ پر وہ دلیل مطالعہ کے قابل ہے۔ اس لئے اس کا بیان کرنا یہاں بے محل نہ ہوگا۔

اقبال اس بات سے بحث کر رہے ہیں کہ آبادی کے بڑھنے سے کاشتکار اور اراضی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ فرماتے ہیں اگر آبادی بڑھے گی تو اسکی

خوراک کے لئے لامحالہ زمین کے وہ ٹکڑے جو پہلے زیرکاشت لائے نہ گئے تھے اور غیر مزروعہ پڑے تھے اب جدید ضرورت کے تحت اور زیادہ اناج پیدا کرنے کی غرض سے ان کو بھی زیر کاشت لایا جائے گا۔ اس سے پہلے کی زیرکاشت زمینوں کی حیثیت اور نتیجتاً ان کا لگان اور بٹائی بھی بڑھ جائے گی اور جاگیرداروں اور زمینداروں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ اب ان پرانی اور نئی مزروعہ اراضی میں محنت و مشقت تو کاشتکار اور زرعی مزدور کرینگے مگر اسکے نتیجے میں زمیندار کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ اقبال کہتے ہیں از روے انصاف زمیندار کو کوئی حق نہیں کہ وہ اس بات سے فائدہ اٹھائے کہ ملک کی آبادی بڑھ گئی ہے۔ یہ دلیل ذرا انہی کی زبانی سنئے :

''مزید برآں یہ امر بھی ظاہر ہے کہ جوں جوں آبادی بڑھتی ہے ضرورت ان زمینوں کو کاشت میں لانے پر مجبور کرتی ہے جو اس سے پہلے غیر مزروعہ پڑی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو زمینیں افزائش آبادی سے پیشتر کاشت کی جاتی تھیں ان کا لگان بڑھ جاتا ہے۔ زمیندار روز بروز دولتمند ہوتے جاتے ہیں حالانکہ یہ مزید دولت جو ان کو ملتی ہے نہ ان کی ذاتی کوششوں اور نہ ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار بڑھنے کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ صرف آبادی کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی ذاتی کوششوں اور ان کی زمینوں کے محاصل کی تعداد میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پھر ان کا کوئی حق نہیں کہ وہ دولتمند ہوتے جائیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کی زیادتی سے قوم کے خاص افراد کو فائدہ پہنچے اور باقی قوم اس سے محروم رہے۔ اگر یہ فائدہ ان کی ذاتی کوششوں یا ان کی زمینوں کے محاصل بڑھ جانے کا نتیجہ ہوتا تو ایک بات تھی لیکن جب ان کی دولت مندی کے یہ اسباب نہیں ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی امیری صریحاً اصول انصاف کے خلاف ہے''*

اور اس سے آگے لکھتے ہیں

''ان نتائج کو ملحوظ رکھکر بعض محققین نے بڑے زور شور سے ثابت کیا ہے کہ یہ سب نا انصافی جائداد شخصی سے پیدا ہوتی ہے جس کا وجود قومی بہبودی کے لئے انتہا درجے کا مضرت رساں ہے۔ پس حکماء کے

*ایضاً، ۱۰۲

اس فریق کے نزدیک زمین کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہونی چاہئے،،**

ان سطور سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مسئلہ ملکیت زمین کے بارے میں اقبال، اپنے ابتدائے فکر ہی سے ایک انداز نظر رکھتے تھے اور تمدن و معیشت کے اس پیچیدہ رخ میں نا انصافی اور زیادتی کا جو جو پہلو پایا جاتا تھا (یا پایا جاتا ہے) اقبال اسکو شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے اور اس کے ازالے کے آرزو مند تھے۔

(٥)

دستکار اور مزدور سے اقبال کی ہمدردی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ فارسی اور اردو زبانوں میں ایسی کئی نظمیں اور اشعار اقبال نے لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محنت کرنے والے طبقے سے ایک خاص تعلق خاطر رکھتے تھے اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا انہیں شدید احساس تھا۔ ''بانگ درا،، کی مشہور نظم 'خضر راہ، کے اس بند کا یہاں حوالہ دیا جا سکتا ہے جس میں اقبال خضر کی زبان سے فرماتے ہیں :

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھکو کھا گیا سرمایہ‌دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

. . . .

اور

دست دولت آفرین کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبونکو زکوٰۃ

''علم الاقتصاد،، کے صفحے صفحے سے یہ تعلق خاطر (Concern) اور ہمدردی ٹپکی پڑتی ہے۔ متعدد مقامات پر اقبال مزدور کے حقوق کی حفاظت میں تیغ بکف نظر آتے ہیں۔ جہاں کہیں مزدور کے ساتھ کوئی نظری یا عملی زیادتی دیکھتے ہیں، اس کا مداوا کرتے ہیں۔ جہاں کوئی ایسا نظریہ یا خیال کسی

**ایضاً صفحہ : ١٥٣

حکیم و مفکر کی طرف سے سامنے آتا ہے جسمیں مزدور کی حق تلفی کا شائبہ تک پایا جاتا ہو، اقبال اس پر جرح و تنقید کرکے اس کی خامی، غلطی یا گمراہی کو بے نقاب کر دیتے ہیں ۔

ابھی اوپر ایک مثال آپ اس قسم کی دیکھ چکے ہیں جہاں اقبال زمیندار کے بلا محنت مزید دولتمند بننے کو نا انصافی قرار دیتے ہیں ۔ یہاں ایک مثال اور درج کرنی کافی ہوگی ۔ یہ اقتباس اگرچہ طویل ہے اور اسے مختصر طور پر پیش کرنا کچھ مشکل نہیں لیکن اسکے استدلال اور طرز بیان میں ایک ایسا جوش و خروش اور ذاتی عنصر پایا جاتا ہے کہ محض اس کا اختصار پیش کردینا اور اسکے اصل الفاظ کے مطالعہ سے قارئین کو محروم رکھنا مجھے ایک طرح کی نا انصافی دکھائی دیتا ہے ۔ بحث کا پس منظر مختصراً یوں ہے کہ بعض انگریز معاشئین کا خیال تھا کہ کسی صنعت سے منافع چاہے کتنا ہی بڑھ جائے اصولاً مزدوروں کی اجرت بڑھانے کا جواز اس سے حاصل نہیں ہوتا، اسلئے کہ صنعت میں جو منافع بڑھتا ہے اس میں کارخانہ دار اور ساھوکار کی تنظیمی صلاحیت کو زیادہ عمل دخل ہوتا ہے اور چونکہ دستکار کی اجرت ایک خاص متعین رقم سے دی جاتی ہے لہذا یہ مطالبہ کہ منافع بڑھ جانے کی صورت میں اسکی اجرت بھی بڑھادی جائے، غیر معقول اور غلط ہے ۔ منافع ضرور بڑھا مگر وہ رقم تو نہیں بڑھی جو مزدوروں کی اجرتوں کیلئے پہلے سے الگ کرلی گئی تھی ۔ اسلئے مزدوروں کی اجرت بڑھانے کا سوال معاشیات کے اصولوں کے خلاف ہے ۔ انگریز معاشئین کے اس موقف کی تردید میں پہلے تو اقبال ایک امریکی ماہر معاشیات واکر کے خیالات و دلائل پیش کرتے ہیں* اور پھر کہتے ہیں :

''سوال یہ ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کس کا حق ہے ؟ زمیندار کا ؟ نہیں، ہرگز نہیں، کیونکہ اس مسالے میں کوئی زیادتی (اضافہ) نہیں ہوئی جسکو زمین سے نکال کر اشیاء تجارتی کی تیاری میں صرف کیا جاتا تھا ۔ اسکی مقدار وہی ہے جو پہلے صرف ہوا کرتی تھی بلکہ دستکاروں کی کفایت شعاری کیوجہ سے نسبتاً کم ہوگئی ہے ۔ علی ہذا القیاس یہ زیادتی ساھوکار کا بھی حق نہیں ہے کیونکہ سرمائے کی مانگ بدستور وہی ہے جو پہلے تھی ۔ کوئی وجہ نہیں کہ شرح سود میں

---

*'علم الاقتصاد، : ۱۷۴ تا ۱۷۶

ساھوکار کا حصہ نسبتاً بڑھ جائے جبکہ سرمائے کی مانگ میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ بلکہ دستکاروں کا کاریگری میں ترقی کرنا ساھوکار کے حصے کو الٹا کم کرتا ہے۔ کیونکہ کاریگر دستکار کو بالعموم اشیاء تجارت کی تیاری کے لئے اسقدر اوزاروں کی ضرورت نہیں ہوتی جسقدر کہ بھدا کام کرنے والے بےھنر دستکار کو۔۔ اسی استدلال کی بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کارخانہ دار کا حق بھی نہیں ہے کیونکہ کارخانہ دار کا حصہ یا منافع صرف اس صورت میں زیادہ ہوسکتا ہے جبکہ کارخانہ داروں کی تعداد میں زیادتی ہو اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ دستکاروں کی کاریگری میں ترقی کرنا کارخانہ داروں کی زیادتیٔ تعداد کا مستلزم ہو لہذا ثابت ہوا کہ پیداوار محنت کی زیادتی جو دستکاروں کی ذاتی ترقی سے پیدا ہوتی ہے، خود دستکاروں کا حق ہے، زمینداروں، ساھوکاروں اور کارخانہ داروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں،، ۔*

یہاں تھوڑی سی وضاحت کی مزید ضرورت ہے۔ جب سے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس ساٹھ برس کے عرصے میں بے شمار ملکوں کے معاشی حالات میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ روس میں اشتراکی انقلاب برپا ہوا۔ ایشیا اور یورپ کے بہت سے ملکوں نے بخوشی یا حالات سے مجبور ہوکر اس نظام کو قبول کرلیا۔ دو عالمگیر جنگوں کے نتیجے میں اور روس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف یا محتاط ہوکر امریکہ، انگلستان، فرانس اور دیگر متعدد ممالک نے بھی اپنے ہاں کے معاشی نظامات کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوششیں کی ہیں۔ چین کا زبردست معاشی انقلاب بھی اسی سلسلے کی ایک نمایاں اہم کڑی ہے۔ ان حالات میں یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ جو دلیل اور جن حالات کو سامنے رکھ کر اقبال نے یہ طرز استدلال اختیار کیا وہ آج بھی اور ہر کہیں قابل اطلاق اور بجا ہے۔ جو بات یہاں ذہن نشین کرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اقبال زمیندار، ساھوکار اور کارخانہ دار کے مقابلے میں مزدور کے حقوق کی بڑی دور تک اور نہایت مستعدی کے ساتھ حفاظت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ لہجہ اور یہ انداز ''علم الاقتصاد،، میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

---

*ایضاً صفحہ : ۱۲۸

اس حصۂ مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور بیان کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جیسا میں نے کہیں اوپر بیان کیا ہے 'علم الاقتصاد' سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے کتاب لکھنے سے پہلے نہ صرف عام معاشیات کا مطالعہ کیا تھا بلکہ اسوقت کے ہندوستان کے مخصوص معاشی مسائل کو سمجھنے اور ان کی تہ تک پہنچنے کی نہائت مخلص کوشش کی تھی۔ کتاب میں کئی ایسے مقامات ہیں جن کے لکھنے میں "کتابی علم" اور 'عام معلومات' کام نہ دے سکتے تھے۔ تاوقتیکہ لکھنے والے نے اپنے طور پر ان تمدنی حقائق پر خود غور و فکر نہ کیا ہوتا۔ حصۂ چہارم کے ایک باب میں وہ اس امر سے بحث کر رہے ہیں کہ صنعت میں اگر کامل مقابلہ (Competition) کی صورت نہ پائی جائے تو دستکاروں پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ عام دستکار کی بے بسی اور بیچارگی کا جو نقشہ اقبال نے اس مقام پر کھینچا ہے، حیرتناک حد تک آج بھی بہت سے ملکوں میں وہی کیفیت پائی جاتی ہے اور اس مشکل کا جو حل تجویز کیا ہے، آج بھی اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ حل سنجیدگی کے ساتھ قبول کیا جائے۔ بعض نہایت ترقی یافتہ ملکوں کو چھوڑ کر اکثر ممالک میں مزدور جب بیکار یا بے روزگار ہو جاتا ہے تو اسکی معاشی ذمہ داریوں کو سہارا دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ریاست یا کوئی ادارہ اسکی اور اسکے بال بچوں کی دیکھ بھال کے لئے آگے نہیں بڑھتا۔ اس صورت حال کو بیان کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں :

"جو مصیبت کا مارا زندگی کی دوڑ میں ایک دفعہ منہ کے بل گر گیا، وہ پھر نہیں اٹھ سکتا۔ اور موجودہ حالت میں ایسے اسباب بھی موجود نہیں جن کا عمل اس بدقسمت کو سہارا دیکر اپنے پاؤں پر کھڑا کردے۔ جب کوئی دستکار بے روزگار ہوکر مفلس ہو جاتا ہے تو بالعموم فطری خود داری اور ہم چشموں کی نگاہوں میں وقعت پیدا کرنے کی آرزو اس پر کوئی اثر نہیں کر سکتی، جو قدرتاً انسان کو اوروں سے بڑھ جانے کی ایک زبردست تحریک دیتی ہے۔ مفلسی کا آزار انسان کی روحانی قویٰ کا دشمن ہے۔ اور وہ مایوسی، فکر اور غفلت شعاری، کاہلی اور فلاکت کی اور صورتیں جو اس بلائے بے درماں کے ساتھ آتی ہیں، دستکار کی ذاتی قابلیت اور اسکی محنت کی کارکردگی پر ایسا برا اثر کرتی ہیں کہ اس کے کام کی وہ کیفیت اور کمیت نہیں رہتی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ ایک دفعہ کی شکست بیچارے دستکار کو ہمیشہ کے لئے کارزار زندگی کے ناقابل کر دیتی ہے۔ اور پھر یہ نہیں کہ اس شکست کا

کچھ علاج ہو جائے بلکہ جدید اقتصادی اسباب کا عمل (مثلاً تجارت کی توسیع، محنت کی نئی شاخوں کا کھلنا اور ملک کی روز افزوں اقبالمندی) اس بیچارے کی حالت کو سدھار نہیں سکتا۔ لہذا موجودہ مقابلہ ناکامل کی صورت میں اقتصادی اسباب کا عمل اسطرف میلان رکھتا ہے کہ نظام صنعت میں افراد کا موجودہ اختلاف مدارج روز بروز بڑھتا جائے اور جس فرد یا جماعت کو کسی سبب سے آغاز ہی میں کوئی مصیبت دامن گیر ہوگئی ہو، اس کی حالت بدستور وہی رہے، بلکہ روز بروز ابتر ہوتی جائے۔ تمدن کی ایسی حالت میں ایک نہایت ضروری سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر نظام صنعت مقابلہ کامل کی برکات سے خالی ہو تو اجرت کی مقدار کو بڑھانے اور دستکار کی تمدنی حالت کو سنوارنے کے واسطے کیا وسائل اختیار کرنے چاہئیں،،*

اس سوال کے جواب میں اقبال نے تین چار نقطہ ہائے نظر کو بیان کیا ہے۔ پہلا گروہ جسے وہ 'حکمائے متوکلین' کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس نظریے کا علمبردار ہے کہ نظام صنعت میں قوانین وغیرہ کی مدد سے کوئی دست اندازی نہیں کرنی چاہئے بلکہ اس کو تمام قانونی اور دیگر قیود اور خلل اندازیوں سے آزاد رکھ کر اس بات پر اعتماد کرنا چاہئے کہ بالآخر جو کچھ ہوگا نوع انسانی کے لئے اچھا ہوگا۔

دوسرا گروہ طریق معاونت کا حامی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خود مزدوروں کو اپنے اندر ایسی تنظیم اور ایسی خوبی پیدا کرنی چاہئے کہ وہ مل جل کر امداد باہمی کے اصول پر اپنی صنعتیں قائم کرسکیں تاکہ وہ منافع جو کارخانہ داروں کی جیب میں جاتا ہے، دستکاروں کے پاس رہے۔

ایک بات اور اقبال نے یہ بیان کی ہے کہ دستکار اپنا ملک چھوڑ کر دیگر ممالک میں جاکر آباد ہوں کیونکہ ایسے دستکاروں کی حالت بالعموم پہلے سے بہت بہتر دیکھی گئی ہے۔ اس کے ساتھ اقبال نے ایک گروہ کے حوالے سے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ دستکاروں اور کارخانہ داروں کے درمیان ہمدردی پیدا کی جائے اور یہ بات ان کے ذہن نشین کی جائے کہ قوم کی بہبودی تمام افراد کی بہبودی سے وابستہ ہے۔ اور ایک رشتے کے ضعیف اور کمزور ہوجانے سے تمام قوم کا شیرازہ بگڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

*ایضاً صفحہ ۲۸۳

لیکن خود اقبال نے جو نسخہ اس مصیبت کو دور کرنے کا تجویز کیا ہے وہ ''قومی تعلیم،، کا ہے۔ ان کے نزدیک ہماری بہت کچھ مصیبت، بے تدبیری اور بے مائیگی ہماری جہالت اور بے علمی کے باعث ہے۔ قومی پیمانے پر تعلیم ہر طبقے کو اور بالخصوص قوم کے پسماندہ یعنی دستکار طبقے کو بے اندازہ فائدہ پہنچانے کی اور اس میں زندگی کا ایک ایسا شعور بیدار کرے گی جسکی بدولت اسکے تمام دکھ درد دور ہوسکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

''مگر ہمارے نزدیک کمتی اجرت کا مفید ترین نسخہ قومی تعلیم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس سے دستکار کا ہنر، اسکی محنت کی کارکردگی اور اسکی ذہانت ترقی کرتی ہے۔ اسکے اخلاق سنورتے ہیں اور وہ اس قابل بنتا ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ تعلیم کی مدد سے دستکار اپنے کام کو سہولت کے ساتھ کر لینے کی راہیں سوچ سکتا ہے اور جدید کلوں کا استعمال جلد سیکھ سکتا ہے۔ اور شراب خوری اور ہر قسم کی غلط کاری سے محفوظ رہتا ہے، جو بالعموم جہالت اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔،،*

(۶)

مضمون کے آخر میں میں ''علم الاقتصاد،، کی آخری سطریں بلا تبصرہ درج کرنا چاہتا ہوں اسلئے کہ یہ سطور اپنی جگہ پر اسقدر واضح اور اپنے لکھنے والے کے بنیادی معاشی مسلک کی ایسی کھلی ہوئی تفسیر ہیں کہ انہیں کسی تبصرہ کی حاجت نہیں۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ۱۹۰۳ء میں یعنی انقلاب روس سے کوئی چودہ پندرہ برس پہلے، جبکہ اقتصادیات کا فلاحی تصور ابھی عالم طفولیت میں تھا اور خود یورپ اور امریکہ کے بیشتر معاشی مفکرین غیر انسانی خطوط پر سوچتے تھے، نوجوان اقبال کی حقائق شناسی اور بالغ نظری کا یہ کتنا بڑا ثبوت ہے کہ اس نے دولت کے استعمال کا مقصود ''تمدنی شیرازے کو مضبوط بنانا،، قرار دیا اور ایک ایسے فلسفے کی ضرورت محسوس کی جو معاشی نظام کو اس طرح تنظیم دے کہ اس سے ملک کے ہر طبقے کو فائدہ پہنچے اور انسانی معاشرہ بہ حیثیت مجموعی ترقی کرے۔ معاشیات کا یہی وہ فلاحی تصور ہے جسکو اپنانے اور اختیار کرنے کی آج بھی

---

*''علم الاقتصاد،، صفحہ ۱۸۵

اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کبھی پہلے تھی۔ اور یہی تصور ''علم الاقتصاد،، کا خلاصہ اور اسکی روح ہے۔ متذکرہ آخری سطور یہ ہیں :

''موجودہ محققین اقتصاد کا سب سے بڑا فرض اس بات کا علم حاصل کرنا ہے کہ دولت کے استعمال کے وہ کون کون سے طریق ہیں جن سے تمدن کا شیرازہ مضبوط ہوتا ہے، افراد قوم کی اخلاق اور جسمانی حالت ترقی کرتے ہے اور بہ حیثیت مجموعی ملک کے سیاسی اور اقتصادی نظام کے تمام اجزا ہم آہنگ ہوکر قوم کی بہبودی کا باعث ہوتے ہیں۔ علی ھذا القیاس، یہ دریافت کرنا بھی ضروری ہے کہ صرف دولت کی کون کون سی صورتیں تمدنی اور اخلاقی لحاظ سے انسان کی فطرت پر برا اثر کرتی ہیں اور پیدائش دولت کے پیچیدہ اسباب کو پورا عمل کرنے سے روکتی ہیں۔ انگلستان میں اس وقت دو ارب ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ صرف شراب پر خرچ ہوتا ہے۔ اگر یہی روپیہ کسی اور مفید صورت میں صرف ہوتا تو ملک کی اقتصادی حالت پر نہائت اچھا اثر کرتا۔ موجودہ زمانے میں ایک ایسے فلسفی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو مندرجہ بالا امور کی پوری تفتیش اور تحقیق کرکے ''علم الاقتصاد،، کے اس حصے کو پورا کرے۔،،